انیسویں صدی کے نصف آخر کا سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر

کلیدی الفاظ: #انیسویں صدی # سیاست # سماج # ادب

ڈاکٹر احمد امتیاز

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

Abstract: After 1857, many changes took place in the political, social and literary situations. Changes at each level are reviewed. The origin of the war of independence and its causes and consequences have been highlighted. In this article, the injustices and aggressive attitudes of the British government, the Hindu-Muslim unity and agreement, the conspiracy to create discord between the two natives, the illegal policy of the British government have been highlighted in detail.The situation presented in Khutoot e Ghalib and Dastanbu, Sahbai, Fazal e Haq Khairabadi, Shefta and Maulvi Muhammad Baqar's history on the incident with Sahbai, Sir Syed's History of Bijnor and Asbab e Baghawat e Hind, Zaheer Dehlavi and his Dastan e Ghadar, Fughan e Delhi. Commentary on Tareekh e Hind, Delhi College, Aligarh Movement, Scientific Society, Tehzeeb-ul-Akhlaq, Assessment of Anjuman Punjab, Review of various poetry and prose genres. The early situation of critics has been discussed in this paper.

Key Words: Ninteenth Century, British Rule, Trechery, Rebellion, Ghalib, Dastanboo, Sahbai, Fazal e Haq, Shefta, Sir Syed, Zaheer Dehlavi, Molvi Zakaullah, Delhi College, Aligarh Movement, Scientific Society, Anjuman Punjab.

سیاسی وسماجی پس منظر:

غیر ملکی اقتدار کے خلاف ہندوستان گیر سطح پر جدو جہد کا باضابطہ آغاز ۱۸۵۷ء میں ہوا جسے انگریزی حکومت نے 'فوجی بغاوت' اور ہندوستانیوں نے 'جنگِ آزادی' سے موسوم کیا تھا۔ حالانکہ یہ پہلی جنگِ آزادی کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکی اور اس کے پاداش میں نوّے سال کی مدّت تک ہندوستانیوں کو انگریزوں کی بربریت اور ظلم برداشت کرنے پڑے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے مختلف النوع اسباب تھے۔ ان میں سے ایک سبب لارڈ ڈلہوزی کی الحاق پالیسی تھی۔ اس پالیسی کے تحت ہندوستان کا بیش تر حصہ انگریزوں کی سلطنت میں شامل کر

لیا گیا تھا۔انگریزی حکومت کا یہ خیال تھا کہ اس سے چھوٹی چھوٹی حکومتوں سے چھٹکارہ مل جائے گا۔لہذا اس پالیسی کے تحت انگریزوں نے ۱۸۴۸ء میں ستارا، ۱۸۵۰ء میں جیت پور، ۱۸۵۳ء میں ناگپور، ۱۸۵۴ء میں جھانسی اور ۱۸۵۶ء میں اودھ کی ریاستوں کو ہڑپ لیا۔اس کارروائی نے ہندوستانیوں کے دل پر برا اثر ڈالا جس سے یہ بد دل اور مشتعل ہو گئے۔دوسرا سبب اقتصادی نوعیت کا تھا۔انگریزی حکومت نے جب زمین داروں اور جاگیرداروں کو ان کی املاک سے محروم کر دیا تو بہت سے ہندوستانی جو حکمرانوں اور شہزادوں کے خدمت گار تھے، بے روزگار ہو گئے اور جو وظیفہ خوار تھے وہ اپنے وظیفوں سے محروم ہو گئے۔اس اقتصادی پریشانی نے ہندوستانیوں کے دل میں بغاوت کی چنگاری بھر دی۔تیسرا سبب معاشرتی نوعیت کا تھا۔برطانوی حکومت نے جب ہندوستانی طرزِ معاشرت ،رسم و رواج ،معاشرتی قواعد وضوابط،مذہب اور تہذیب وتمدن میں مداخلت شروع کی تو عوام کے دلوں میں نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے۔ستی رسم کا خاتمہ، ہندو بیوہ کی دوسری شادی،مختلف ذاتوں کا ایک ساتھ کھانا پینا،سمندر پار نوکری کرنے کی شرط پر سپاہیوں کی بھرتی،مندروں کے انتظام کو اپنے ہاتھوں میں لے لینا وغیرہ،کسی طرح بھی ہندوستانیوں کو برداشت نہ ہو سکا۔لہذا برطانوی اقتدار کے خلاف نفرت کا یہ بھی سبب بنا۔ایک اہم سبب عیسائی مذہب کی تبلیغ بھی تھا۔انگریز نہ صرف اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے بلکہ ہندوستانیوں کے مذہبی عقائد اور مقدس مذہبی رہنماؤں کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔یہ بھی ہندوستانیوں کو قبول نہ تھا۔لہذا نفرت اور بے اطمینانی کا لاوا شعلہ فشاں ہو گیا۔اس کے علاوہ ایک فوجی سبب بھی تھا۔انگریزی حکومت، ہندوستانی فوج کی طاقت پر ہی قائم تھی۔ان فوجی سپاہیوں کو انگریزوں کی حمایت میں اپنے ہی ملک والوں کے خلاف لڑنا پڑتا تھا اس کے باوجود ان کے جائز مطالبات کو ٹھکرا دیا جاتا تھا۔اس سے فوجی سپاہیوں کی روایتی وفاداری کو سخت صدمہ پہنچا،دوسری طرف انہیں جبراً ملک سے باہر بھیج دیا جاتا تھا گو ان سب پریشانیوں نے فوجی بغاوت کو فروغ دیا۔

برطانوی اقتدار کی ناانصافی اور بے ایمانی کے کارنامے شعاعِ مہر کی طرح ہندوستانیوں پر عیاں ہو چکے تھے۔انگریزوں نے ان فلڈ رائفلوں کا استعمال کرنا شروع کیا جس میں کارتوس کو چربی سے چکنا کیا جاتا تھا۔یہ چربی سور یا گائے کی ہوتی تھی۔ہندوستانی فوجیوں میں اس کے خلاف ردعمل شروع ہوا اور جب اس کے استعمال سے انکار کیا گیا تو انگریزوں نے زبردستی کرنی

چاہی پھر کیا تھا بغاوت شروع ہوگئی اور اس نفرت کا پہلا بڑا دھما کہ میرٹھ کی چھاؤنی میں ہوا۔ پھر دلی، سردھنا، باغپت، رڑکی، مظفر نگر، علی گڑھ، بلند شہر، سہارن پور اور اس طرح تمام ملک میں بغاوت کی لہر پھیل گئی۔ یہ جنگ آزادی تقریباً دو برس تک چلتی رہی۔ ۱۸۵۹ء تک آتے آتے انگریزی حکومت نے تمام شورشوں پر قابو پالیا اور اپنے تمام تر حریفوں کو پامال کر کے جنگ کو ناکام بنا دیا۔ اگر چہ یہ جنگ ناکام رہی لیکن جس طرح ہندوستانی متحد و متفق ہو کر ہمت و استقلال اور شجاعت و ایثار کے ساتھ اس عظیم جدو جہد میں انگریزوں کے خلاف اپنی نفرتوں کا اظہار کرتے رہے، وہ قابلِ احترام ہے۔ ہندو اور مسلم دونوں قوموں نے کندھے سے کندھا ملا کر حصولِ آزادی کی لڑائی لڑی۔

اس جنگ آزادی کی ناکامی کے بھی کئی اسباب تھے۔ حرّیت پسندوں کی کوئی تنظیم نہیں تھی۔ رہبری کا فقدان تھا۔ ان کے پاس اسلحہ اور کارتوسوں کی کمی تھی۔ خبر رسانی اور مخبری و جاسوسی کے ذرائع نہیں تھے۔ عوام کے پاس مستقبل کی تعمیر کا کوئی واضح خاکہ نہیں تھا کہ نجات کے بعد کس طرح حکومت قائم کی جائے گی۔ بیشتر والیانِ ریاست نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ غرض یہ کہ متعدد اسباب کی بنا پر یہ جنگِ آزادی ناکام ہوگئی اور ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر تاجِ برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا۔ اس ناکامی کے باوجود ہندوستانیوں کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ انگریز ناقابلِ شکست نہیں ہیں، اگر ان سے برابر کی سطح پر جنگ کی جائے تو فتح حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ہندوستانی عوام انگریزی حکومت کے خلاف منظم اور متحد ہونے لگی۔ انگریزی زبان کی تعلیم، نسلی تنازعے اور معاشی ابتری کی وجہ سے عوام میں قومی اور سیاسی شعور بے دار ہونے لگا۔ مذہبی اور اصلاحی تحریکوں نے اس شعور و احساس کو بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اخبارات اور پریس نے ہندوستانی عوام میں قومی جذبات و خیالات کی تبلیغ کی۔ ۱۸۶۱ء کے کونسلس ایکٹ اور انڈین کورٹ ایکٹ سے عوام میں ایک بار پھر بے چینی اور بے اطمینانی پیدا ہوگئی کیوں کہ ان کے ذریعے جو سہولتیں ہندوستانیوں کو ملیں وہ سمندر میں قطرے کی مانند تھیں۔ ۱۸۶۴ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیان وہابیوں پر بغاوت کے پانچ بڑے مقدمے چلے ان لوگوں نے حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دینے میں بڑی مدد کی تھی لہٰذا متعدد وہابیوں کو حکومت کے خلاف سازش کرنے کے جرم میں موت اور عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ ۱۸۷۵ء میں راجہ ملہار راؤ کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں کرنل فیئر کے قتل کا مجرم قرار دیا گیا۔ اس واقعہ سے ہندوستانیوں

میں حب الوطنی کے جذبات مزید بڑھ گئے۔

جنگِ آزادی میں ہندو مسلم دوش بدوش شریک تھے۔ برطانوی حکومت کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کی متحدہ جماعت ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ لہذا انہوں نے اپنی حکمتِ عملی کو بدلنا بہتر سمجھا اور ہندو مسلم کے درمیان خلیج اور نفرت پیدا کرنے کی چال چلی۔ سر چارلس ڈ ڈ جو ہندوستانی معاملوں کا سیکریٹری آف اسٹیٹ تھا، لارڈ ایلگن اور کراسن ڈفرن کے خطوط آج بھی موجود ہیں جن میں ان دونوں قوموں کے درمیان اتحاد ختم کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ سر چارلس وُ ڈ، لارڈ ایلگن جو اس زمانے میں 'وائس رائے' تھا، کو ایک خط میں لکھتا ہے:

''ہم ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر اب تک حکومت قائم کئے ہوئے ہیں، ہمیں اسی حکمتِ عملی پر چلتے رہنا چاہئے۔''

("Wood papers" Wood to Elgon. vol:10, March 3rd 1862.)

ایک اور خط میں وُڈ، ایلگن کو لکھتا ہے کہ

''دونوں قوموں میں تفریق پیدا کرنے والی اسپرٹ کو بنائے رکھنا ضروری ہے۔''

("Wood papers" Wood to Elgon. p220, vol:10, March 3rd 1862.)

ان دونوں قوموں کے اتحاد کو ختم کرنے کی اس کوشش کے پیچھے ایک سبب یہ بھی تھا کہ انگریزی حکومت یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ مسلمان اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے جنگِ آزادی کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ اس فکر سے مغلوب ہو کر انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو مزید پریشان کرنا شروع کر دیا اور بہت نقصان پہنچایا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمان کسی بھی طرح سے انگریزوں سے مصالحت کرنے پر راضی نہ تھے مگر ہندوؤں کے دلوں میں مصالحت کی خواہش پیدا ہو چکی تھی۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ حکومت نے جب انگریزی کو فارسی زبان کی جگہ سرکاری زبان قرار دیا تو اس سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جو فارسی زبان کی بنیاد پر روزی روٹی حاصل کر رہا تھا، محروم ہو گیا۔ ہندوؤں کے لئے فارسی اور انگریزی دونوں زبانیں غیر ملکی تھیں لہٰذا اس نئی سرکاری زبان کے خلاف آواز اٹھانے کے بجائے انگریزی زبان سیکھنے پر راضی ہو گئے۔ ہندوؤں کی اس انگریز دوستی سے مسلمانوں کے دلوں کو ٹھیس پہنچی اور تفریق کی صورت پیدا ہوتی چلی گئی اور اس طرح انگریزی حکومت تفرقہ پیدا کرنے کے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندوؤں کے ساتھ اپنی عقیدت کا بھرپور

اظہار کیا اور مسلمانوں پر خوب ظلم ڈھائے۔ امتحانوں میں ہندو طلباء کو کامیاب اور مسلم طلباء کو جان بوجھ کرنا کام کر دیا جاتا۔ ۱۸۷۱ء میں انگریزی اسکولوں سے ۷۶ وظیفے دیئے گئے جن میں صرف ایک مسلم تھا۔ ۱۸۶۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کے امتحان میں صرف ۱۳ طلبہ کامیاب ہوئے جن میں صرف ایک مسلم تھا۔ انگریزوں کی اس پالیسی نے ہندو مسلم اتحاد کا خاتمہ کر دیا اور جب وہ اس مہم میں کامیاب ہو گئے تو مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ وہ اس میں بھی کامیاب ہوئے اور مسلمان ذہنی اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک طبقہ وہ تھا جو روایتی اور مذہبی اصولوں کی پاس داری کر رہا تھا۔ ان میں مدرسہ دیوبند کے علماء شریک تھے۔ انہوں نے انگریزوں کی پالیسی کی کھل کر مخالفت کی اور قرآن واحادیث کی روشنی میں اذہان کی تربیت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اس طبقے نے غلامی کو چیلنج کے طور پر قبول کیا اور کمر کس کر اپنی ذہنی صلاحیت کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ دوسری جانب وہ طبقہ تھا جس کی رہنمائی سرسید کر رہے تھے۔ سرسید مغربی تعلیم کی مخالفت کے بجائے اس کی روشنی میں ذہنی تربیت کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ مغربی تعلیم پر زور دے رہے تھے تاکہ حکومت اور انتظامیہ کی بھی نمائندگی ہو سکے۔ اس طرح مدرسہ دیوبند کے علماء خصوصاً محمد قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی نے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت کی اور سرسید نے اسے ہندوؤں کی تنظیم کہہ کر اس کی مخالفت اور مذمت کی۔ اس طرح ملک میں آزادی کی جدوجہد آپس کے تنازعے کے سبب بنیادی مقصد سے کٹ کر رہ گئی۔ یہ ذاتی اور نظریاتی اختلافات وقت کے ساتھ بڑھتے گئے۔ حالات کی کشمکش نے ایسے مسائل کھڑے کر دیے کہ سرسید جو کبھی ہندو اور مسلم کو دو آنکھوں سے تشبیہہ دیا کرتے تھے، کھل کر ہندوؤں کی مخالفت کرنے لگے۔ اس کے پیچھے ہندوؤں کی بے وفائی اور نازیبا حرکات کو بھی دخل تھا۔ ہندو مسلم کشیدگی سے اردو ہندی کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا۔ زمین کے بندوبست کے بعد مسلمانوں کی مالی حالت کمزور ہوتی گئی۔ سرسید چاہتے تھے کہ حکومت اور انتظامیہ اس کا حل تلاش کریں اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے واقفیت ہو۔ مسلمانوں کے ان دو گروہوں کے علاوہ ایک طبقہ اور بھی تھا جس کی نمائندگی بدرالدین طیب جی کر رہے تھے۔ یہ طبقہ مغربی علوم کے حصول کا طرف دار تو تھا مگر ملک کی آزادی کے بنیادی مقصد سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اس طبقے کا خیال تھا کہ ملک کی آزادی کے بعد اندرونِ ملک کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ملک کی آزادی کے لئے جو اقدام مل جل کر اٹھائے گئے تھے، اٹھارہویں صدی کے آخر تک آتے

آ تے گروہوں اور قوموں میں بٹ کر رہ گئے۔

ادبی پس منظر:

انگریزوں کے اقتدار سے قبل ادیب اور شعرا دربار سے وابستہ ہوا کرتے تھے۔ کسی ادبی تنظیم کا وجود نہ تھا اور نہ ہی ان کی تخلیقات عوام کے لئے ہوتی تھیں بلکہ یہ داد و تحسین اور انعامات حاصل کرنے کی غرض سے تحریر کی جاتی تھیں۔ فورٹ ولیم کالج اور دلّی کالج کے قیام سے عوام میں نیا شعور پیدا ہوا اور ادب کو عوام سے اور عوام کو ادب سے قریب آنے کا موقع ملا۔ فنونِ لطیفہ اور علوم مفیدہ کو ان اداروں سے خوب ترقی حاصل ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے ہندوستانیوں کو نئے اندازِ فکر سے روشناس کرایا۔ اس بے داری میں بالواسطہ یا بلا واسطہ ان دو اداروں کی ادبی سرگرمیوں کا بڑا دخل ہے۔ سرسید احمد کی تحریک نے اسے اور آگے بڑھایا اور نئے انداز سے ادب کی جہات سے ہندوستانیوں کو واقف کرایا۔ اس دور میں جو ادب ضبطِ تحریر میں آیا کم و بیش اس کا موضوع جنگِ آزادی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل تھے۔ جنگِ آزادی کے دوران جو کتابیں وجود میں آئیں ان میں مرزا غالب کی تصنیفات خصوصاً 'خطوطِ غالب' اور 'دستنبو' (فارسی زبان میں لکھا گیا روز نامچہ) کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ مرزا اس دور کے تمدن اور روایات کے بہترین ترجمان تھے کیونکہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے عزیز دوست امام بخش صہبائی کو دو بیٹوں سمیت گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ نیز مولانا فضل حق خیر آبادی، مصطفٰی خاں شیفتہ، مولانا محمد باقر کے ساتھ انگریزی حکمران نے جو سلوک کیا، غالب اس کے چشم دید گواہ تھے۔ اس لئے جب فارسی زبان میں روز نامچہ لکھتے تھے یا دوستوں اور عزیزوں کو خط لکھتے تھے تو ان میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کی دہشت گردی، قتل، پھانسی، دہلی کالج کا چھاؤنی میں تبدیل ہو جانا، بے گناہ امراء پر چلائے گئے مقدمے اور روز مرہ کی مشکلات اور مصائب کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے　　زہر ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دلی کا ذرّہ ذرّہ خاک　　تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا

اس کے علاوہ ان کی بہت سی غزلیں ہیں جن میں اس ہنگامہ خیز دور کا دردناک ذکر ملتا ہے۔ اسی دور

میں سرسید نے 'تاریخ سرکشیِ بجنور' اور 'اسباب بغاوت ہند' لکھی جوان کے ذاتی تجربے اور بغاوت سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا نتیجے ہیں۔ ان میں انگریزوں کی پالیسی پر ضرب بھی لگائی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''یہ سرکار کا کام تھا کہ وہ کوشش کرے اور رعایا کی ہمدردی حاصل کرے نہ کہ رعایا کا فرض کہ وہ حکومت کے لطف و کرم کو حاصل کرنے کی سعی کرے۔ اب برطانوی سرکار کو قائم ہوئے سو سال سے بھی اوپر ہو چکے ہیں لیکن اب تک اس نے لوگوں کے دل نہیں جیتے۔''

اسی زمانے میں ظہیر دہلوی نے جو بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ شاعر تھے 'داستانِ غدر' کے نام سے اپنی آپ بیتی لکھی۔ اس میں بھی دہلی کے واقعات، مصائب اور ان لوگوں کے آلام کا تذکرہ ہے جن پر باغیوں کے ساتھی اور ہمدرد ہونے کا شک تھا۔

اسی زمانے میں 'فغان دہلی' کے نام سے ۱۸۶۱ء میں نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا جس میں چالیس شعراء کا کلام منتخب کیا گیا تھا۔ ان نظموں میں دہلی کی بربادی، لوٹ مار، یہاں کے امراء و شرفاء کے مصائب بیان کئے گئے تھے۔ ان کے علاوہ مولوی ذکاء اللہ کی 'تاریخ ہند' (جلد نہم)، نذیر احمد کا ترجمہ 'روز نامچہ غدر' (انگریزی سے ترجمہ)، آغا حجو شرف کی طویل نظمیں جو لکھنؤ کی غارت گری پر نظم کی گئیں تھیں۔ واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی، بہادر شاہ ظفر اور برق لکھنوی کی بہت سی نظمیں ہیں جن میں اس دور کے واقعات کی واضح جھلکیاں ملتی ہیں۔ محمد حسین آزاد نے بھی انگریزوں پر ہندوستانیوں کی فتح کے موضوع پر ایک نظم لکھی تھی جو ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کو 'دہلی اخبار' میں شائع ہوئی تھی۔

اس دور کے ادب میں مذہبی انداز فکر اور قومیت کا جذبہ خوب نمایاں رہا۔ اس کے علاوہ ترقی پسندی اور رجعت پسندی، امید و یاس، حکمراں طبقے کے ساتھ وفاداری اور اس کے طور طریقوں کے خلاف احتجاج بھی نظر آتے ہیں۔ نظم اور نثر کی کئی نئی اصناف کا ظہور بھی اسی زمانے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ناول، ناٹک، انشا پردازی، سوانح نگاری، تنقید اور طویل نظمیں اسی زمانے میں مروج ہوئیں۔ قدیم اور جدید اسالیب کا امتزاج جس کی ترقی اور اشاعت میں چھاپہ خانے کو بڑی اہمیت

حاصل تھی، اسی زمانے کی مرہونِ منّت ہے۔ سر سید، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد اور شرر کی تصانیف میں نئے شعور اور نئی روح کی کارفرمائی بھی اس زمانے میں نظر آتی ہے۔ حالی 'ہمیں وقت کے ساتھ بدلنا چاہئے' پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان تمام ادیبوں اور شاعروں نے تبدیلی کی ضرورتوں کو تسلیم کیا اور نئی زندگی کے راستے ہموار کئے۔ ان ادباء و شعراء کے یہاں نثر اور نظم دونوں کو خاص طور سے موضوع بنایا گیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ادب کو دنیاوی حقائق کا آئینہ ہونا چاہئے اور لوگوں کو تغیرِ زمانہ کو قبول کرنا چاہئے تاکہ اس کے مطابق اپنی تقدیر بنا سکیں۔

دلی کالج:

دلی کالج کا قیام ۱۸۲۵ء میں عمل آیا جو ۱۷۹۲ء میں قائم ہونے والے مدرسہ غازی الدین کی توسیع تھا۔ اس کے دو بنیادی مقاصد تھے (۱) انگریزی نظام کی بحالی اور حکمرانی کے لئے ہندوستانی معاشرے کی تفہیم (۲) ہندوستانی عوام کو انگریزی زبان کی تعلیم اور مغربی تہذیب کی ترویج واشاعت۔ اس کے لئے ذریعہ تعلیم اردو رکھا گیا اور نصاب کی کتابوں کو تراجم کے ذریعے اردو میں منتقل کیا گیا۔ جن انگریزوں کی وجہ سے یہ کالج احیاء العلوم کا مرکز بنا ان میں مسٹر ٹیلر، فلیکس بوترو، کارگل اور ڈاکٹر اسپرنگر کے نام سرفہرست ہیں۔ اس کالج کا قیام اگرچہ انگریزوں کی سیاسی مصلحت پر مبنی تھا لیکن اس تحریک نے اردو کے دامن کو بیش بہا فائدے پہنچائے۔ ان انگریز اساتذہ کا طویل مدت تک ہندوستان میں قیام رہا۔ انہوں نے ہندوستانی مزاج اور نفسیات سے پوری طرح ہم آہنگی اور شناسائی حاصل کی اور مشرقی علوم کو پروان چڑھایا۔ فلیکس بوترو نے مغربی علوم کو رائج کرنے کے لئے اردو زبان کو وسیلہ بنایا اور ورنیکلر سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس سوسائٹی کے تحت بہت سی مغربی علوم کی کتابیں ترجمے کے ذریعے اردو میں آئیں جس سے بہت کم عرصے میں متنوع مضامین ہندوستانیوں کی علمی دسترس میں آ گئے جب ڈاکٹر اسپرنگر اس کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تو انہوں نے مزید تحریک پیدا کی اور مشرقی علوم کی ترقی میں سرگرم حصہ لیا۔ صحیح بخاری، بہارِ عجم اور آثار الصنادید کی تالیف انہی کی تحریک پر ہوئی۔ انہوں نے 'قران السعدین' کے نام سے کالج کا مجلہ بھی جاری کیا۔ ٹیلر کالج کے قیام سے لے کر ۱۸۵۷ء تک علمی و ادبی کام انجام دیتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں ان کا قتل ہو گیا جس کے الزام میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر جو دلی اردو اخبار کے مدیر تھے، کو گولی مار دی گئی۔ چونکہ اس کالج

نے عوام کو توجہ کا مرکز بنایا تھا اس لئے ہندوستان کی ادبی معاشرتی اور سیاسی زندگی پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔علم وادب کے ساتھ ساتھ شخصیت سازی میں بھی نمایاں کام انجام دیا اور ایسی ایسی ادبی شخصیتیں پیدا کیں جن کا حریف ملنا مشکل ہے۔

ماسٹر رام چندر دلی کالج میں ذہین اور روشن استاد کے طور پر معروف تھے۔اسی کالج میں وظیفے پر تعلیم حاصل کی اور یہیں پر یورپین سائنس کے استاد مقرر ہوئے۔انہوں نے عیسائی مذہب تبدیل کرلیا تھا جس سے ان کی بڑی مخالفت ہوئی۔پہلے رڑکی پھر پٹیالہ میں پناہ لی اور وہیں انتقال کیا۔انہوں نے علمی مباحث کے لئے دو رسالے'فوائد الناظرین' اور 'خیر خواہِ ہند' جاری کئے۔سائنسی اور معاشرتی موضوعات پر علمی مضامین لکھے جس کے اثرات محمد حسین آزاد اور نذیر احمد کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ان کی تصنیفات میں اعجاز القرآن، اصولِ جبر و مقابلہ، عجائباتِ روزگار، تذکرۃ الکاملین اور ریاضی کی متعدد کتابیں شامل ہیں۔

مولوی مملوک علی نانوتوی دلی کالج میں کشادہ نظر استاد کی حیثیت سے معروف تھے۔صدر مدرس بھی رہے اور عربی، فارسی اور اردو میں تعلیم دی۔مولوی ذکاء اللہ، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے ادبی ذوق کی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔انہوں نے ورنیکلر سوسائٹی کے لئے چند کتابوں کے ترجمے بھی کئے اس کے علاوہ کالج کی ملازمت کے دوران تحریک ولی اللٰہی میں سرگرم حصہ لیا اور امیر امداد اللہ، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی تربیت کی۔

امام بخش صہبائی فارسی کے فاضل استاد تھے اور دلی میں ذی علم استاد کی حیثیت سے مشہور تھے۔غالب، شیفتہ اور آزردہ کے رفیقوں میں سے تھے۔بے حد وضع دار اور روشن خیال شخصیت کے مالک تھے۔انہوں نے 'حدائق البلاغت' کا ترجمہ کیا۔شعرائے اردو کا ایک انتخاب اور صرف ونحو پر ایک تصنیف بھی ان کی خدمات میں شامل ہے۔ان کی اہمیت یہ ہے کہ تقریباً ایک صدی تک ان کی کتابیں نصاب میں شامل رہیں۔

ماسٹر پیارے لال آشوب دلی کالج سے فارغ التحصیل تھے اور یہیں کے رہنے والے تھے دلی کالج نے جس طرح ان کی مزاج سازی کی تھی وہ اسی طرح تصنیف وتالیف کے کاموں میں لگے رہے۔انہوں نے 'قصصِ ہند' حصہ اوّل وسوم، 'رسومِ ہند کا ابتدائی حصہ' اور 'تاریخ انگلستان' لکھی۔'دربارِ قیصری' ان کی ترجمہ شدہ کتاب ہے۔تعلیمی خدمات کے علاوہ انہیں اتالیقِ پنجاب کا

مدیر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دلی کالج بند کر دیا گیا۔ ۱۸۶۴ء میں اسے دوبارہ فعال بنانے کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ مل سکی۔ ۱۸۷۷ء میں کالج کے قیام کو ختم کر دیا گیا اور اساتذہ کو گورنمنٹ کالج لاہور میں منتقل کر دیا گیا۔ دلی کالج کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے کالج کے طلبا کی تربیت و تعلیم اور شخصیت سازی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انہیں آزادانہ خیالات پیش کرنے کی تربیت دی اور ان میں قومی خدمات سرانجام دینے کی صلاحیت پیدا کی۔ بعض طلبا کو اردو ادب میں بقائے دوام حاصل ہے مثلاً: محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد۔ مولوی کریم الدین کے ذوق کو دلی کالج میں ہی جلا ملی۔ انہوں نے 'تذکرہ طبقات الشعرائے ہند' کو گارساں دتاسی سے ماخوذ کر کے مرتب کیا۔ ان کی 'گلدستۂ نازنیناں'، 'تعلیم النساء' اور 'تاریخِ شعرائے عرب' بھی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس طرح دلی کالج نے ادبی و علمی فضا کو قائم کرنے اور مستقبل کی راہ ہموار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

علی گڑھ تحریک (سر سید تحریک):

علی گڑھ تحریک یا سر سید تحریک کے آغاز کا محرک بنیادی طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تھا۔ سر سید احمد خاں کی ابتدائی زندگی مختلف تحریکوں کی گود میں پھلی پھولی تھی۔ ان تحریکوں نے ان کی ذہنی پرورش میں خاصا اہم رول ادا کیا۔ ابتداء میں سر سید تصنیف و تالیف میں دلچسپی لیتے رہے۔ ۱۸۴۱ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک مختلف موضوعات پر (خصوصاً تاریخی) ان کی پندرہ کتابیں منظر عام پر آ چکی تھیں اور سر سید ایک عالم، ادیب، سیاست داں اور مفکر کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے۔ جب سر سید کا قیام دلی میں ہوا تو ان کی فکری اور عملی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی اور علی گڑھ تحریک کا وہ بیج جو ان کے زیر ذہن پرورش پا رہا تھا اپنے اظہار کو مچلنے لگا۔ انگریزوں سے بغاوت کا الزام مسلمانوں کے سر تھا جس کے ردعمل میں مسلمانوں نے انگریز دشمنی کو اپنا مذہبی فریضہ بنا لیا تھا۔ اس تصادم اور کشمکش نے سر سید کے ذہن کو ماضی کے تحفظ اور مستقبل کے امکانات کی طرف موڑ دیا۔ چنانچہ سر سید جو اب تک سید احمد بریلوی کے نظریے کے قائل تھے ان کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے انگریزوں کے خلاف اس کے ہی ہتھیار کو حربے کے طور پر استعمال کرنے کی ترغیب دی۔ سر سید اس خطرے سے آگاہ تھے کہ انگریز نہ صرف مسلمانوں

سے ان کی حکومت چھین لینا چاہتا ہے بلکہ انہیں مذہبی عقائد سے بھی دور کر دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۶۰ء کے بعد سرسید نے دو اہم کام انجام دیے۔ایک قیام مدرسہ غازی پور اور دوسرا سائنٹفک سوسائٹی۔ مدرسے کے قیام کا مقصد بڑوں کو نئی تعلیم سے متعارف کرانا تھا۔ انگریزی تعلیم چونکہ مذہب کے خلاف تصور کی جارہی تھی اس لئے سائنٹفک سوسائٹی نے نئے علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنا شروع کیا۔مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے لئے سرسید کا یہ اقدام بڑا کارآمد ثابت ہوا اور مختصر سے عرصے میں مغربی علم وفنون کی چالیس کتابیں ترجمہ کر دی گئیں۔ان میں اسکاٹ برلن کا 'علم فلاحت'،مّل کی'سیاحت مدن'، ٹامسن کا'علم آب وہوا'، ہیرس کا'رسالہ برقی' وغیرہ اہم ہیں ۔

سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ تحریک کا پہلا عملی نمونہ تھا جس نے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے ذہن کو متحرک کیا۔سوسائٹی نے حصولِ مقصد کے لئے''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اخبار کا اجرا کیا جس نے مسلمانوں میں سیاسی اور ادبی شعور کو بیدار کرنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا۔۱۸۶۷ء میں سرسید کے ذہن میں ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال آیا۔وہ اس یونیورسٹی کی بنیاد ایسے طرز پر رکھنا چاہتے تھے جس میں انگریزی کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم کا درس بھی دیا جا سکے۔اس سلسلے میں انہوں نے گورنر جنرل کو اپنی عرض داشت بھیجی، جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں اُن تمام علوم کو جن کا امتحان کلکتہ یونیورسٹی انگریزی میں لیتی ہے، دیسی زبان یعنی اردو میں لے اور اس یونیورسٹی سے فراغت حاصل کرنے والے طلبا کو یکساں معیار کی سند عطا کی جائے۔اس کے ساتھ ساتھ سرسید نے یہ بھی پیش کش کی کہ انگریزی سے اردو زبان میں تراجم کا کام سائنٹفک سوسائٹی کے سپرد کی جائے لیکن سرسید کی یہ تجویز کامیاب نہ ہوسکی کیوں کہ تراجم کے لیے صرف یونیورسٹی کی نصابی کتابوں کی اجازت دی گئی تھی جبکہ سرسید علمی کتابوں کا ترجمہ بھی چاہتے تھے۔دوسری طرف ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کے لیے کسی جگہ کا تعین نہیں ہوسکا تھا۔ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سائنٹفک سوسائٹی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے قدامت پسند طبقوں کے درمیان یہ کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی تھی۔لہٰذا اس کے خلاف ردعمل شروع ہوگیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ سررشتۂ تعلیم پنجاب نے یونیورسٹی کے قیام کے لیے لاہور اور تراجم کے لیے دہلی کو منتخب کیا۔اس فیصلے پر سرسید نے محسوس کیا کہ اس طرح ان کے مقصد کی تکمیل نہیں ہوسکتی چنانچہ سرسید کی دلچسپی

اس معاملے میں ختم ہوگئی۔

لاہور میں ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کے بعد جب اس کی شہرت بڑھی تو ہندو پریس والے تعصب پسند ہو گئے اور اردو زبان کی مخالفت پر اتر آئے۔ جب مخالفت کی لہر تیز ہوگئی تو سرسید نے محسوس کیا کہ اب ان دو قوموں کا ساتھ ساتھ چلنا مشکل ہے۔ سرسید جو اب تک ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں تھے، کھل کر مسلمانوں اور اردو زبان کے تحفظ پر زور دینے لگے۔ ۱۸۶۹ء میں جب سرسید نے لندن کا سفر کیا تو وہاں کی طرز زندگی اور مغربی طرز تعلیم نے انہیں بہت متاثر کیا۔ جس سے ان کی فکر میں نئی تبدیلی آئی۔ لندن میں ہی انہوں نے ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' کا مدلل جواب 'خطباتِ احمدیہ' لکھ کر دیا۔ قیامِ لندن ہی میں ان کے ذہن میں کیمبرج کے طرز پر ہندوستان میں بھی ایک محمڈن یونیورسٹی بنانے کا خیال آیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں سے نکلنے والے اخبار ٹٹلر اور اسپکٹیٹر جس نے وہاں کی معاشرتی ناہمواریوں کو دور کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا، کے طرز پر ہندوستان میں بھی اخبار نکالنے کا خیال پیدا ہوا۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد سرسید نے تہذیبی زندگی میں انقلاب لانے اور اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے علی گڑھ میں 'مدرسۃ العلوم' کی بنیاد ڈالی اور اخبار 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا۔

سرسید کی تحریک کثیر المقاصد اور ہمہ جہت تحریک تھی۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اس تحریک نے تہذیبی معاشرتی اور سیاسی ناہمواریوں کو دور کرنے کی سعی کی۔ مذہبی نقطۂ نظر سے اس نے مغربی علوم کی روشنی میں عقائد کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ ادبی زاویے سے اس تحریک نے اردو زبان کے فروغ میں گراں قدر کردار ادا کیا۔ سرسید کی اس تحریک نے ادباء کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جن میں بیشتر کو انجمن کی حیثیت حاصل ہے۔ سرسید کی اس تحریک کی مخالفت ان کے زمانے میں ہی شروع ہوئی۔ مولوی علی بخش شرر نے 'تہذیب الاخلاق' میں شائع ہونے والے مابعد الطبیعاتی مضامین کی کھل کر مخالفت کی۔ سید امداد علی نے 'تہذیب الاخلاق' کی مخالفت میں رسالہ 'امداد الآفاق' جاری کیا اور سرسید کے خلاف مذہبی نوعیت کے مضامین لکھے۔ محمد قاسم نانوتوی نے مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی اور سرسید کی انگریز پرستی کی مخالفت کی۔ ان کے علاوہ اکبرالہ آبادی نے اپنی نظموں کے ذریعے، منشی سجاد حسین نے 'اودھ پنچ' کے ذریعے اور پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنی نثر

نگاری کے ذریعے، سرسید کی تحریک کی مخالفت کی۔

سرسید کی تحریک کو پروان چڑھانے میں ان کے رفقاء نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ان میں نواب سید مہدی علی محسن الملک (متوفی ۱۹۰۷ء) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔انہوں نے مذہبی مباحث کو سائنسی علوم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔مولوی چراغ علی (متوفی ۱۸۹۵ء) نے سرسید کی فکریات کو عام کرنے کے لئے عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبان کا سہارا لیا اور علی گڑھ تحریک کے افکار و خیالات کی تبلیغ کی۔نواب وقار حسین وقار ملک (متوفی ۱۹۱۷ء) نے سرسید کے تصور کو اپنے مضامین میں پیش کیا۔انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے سرسید کے دوش بدوش جدو جہد کی۔علی گڑھ تحریک کے سرگرم رفقاء میں الطاف حسین حالی (متوفی ۱۹۱۴ء) کو بھی گراں قدر حیثیت حاصل ہے۔جدید شاعری اور اردو تنقید حالی کی ہی رہین منت ہے۔ان کی شاعری اور تنقید علی گڑھ تحریک سے ہی متاثر ہو کر وجود میں آئی۔انہوں نے سرسید کی سوانح 'حیاتِ جاوید' کے نام سے لکھی۔علامہ شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) بھی سرسید کے رفقاء میں شامل تھے۔انہوں نے سرسید کے فکری زاویے کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔شبلی کی بیشتر تصانیف علی گڑھ تحریک کی روح سے معمور ہیں۔مولوی نذیر احمد (متوفی ۱۹۱۲ء) بھی سرسید تحریک کے سرگرم رکن تھے۔انہوں نے سرسید کی تحریک کے اثرات کو علی گڑھ سے نکال کر دور دراز علاقوں تک پہنچا دیا۔ان کے علاوہ مولوی ذکاء اللہ (متوفی ۱۹۱۰ء)، وحیدالدین سلیم (۱۹۲۸ء) اور عبدالحلیم شرر (متوفی ۱۹۲۶ء) بھی سرسید کے رفیق کار میں شامل تھے۔تحریک کو مثبت راہ دکھانے میں ان لوگوں نے گراں قدر کارنامہ انجام دیا۔

علی گڑھ تحریک نے مغربی علوم کی مخالفت کے بجائے اس کے ساتھ چلتے ہوئے صداقت کا اظہار کیا۔لہٰذا سوانح نگاری اور سیرت نگاری پر اس کے گہرے نقش مرتب ہوئے۔حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدی، سیرۃ النبی، المامون، الفاروق، الغزالی اور سوانح مولانا روم جیسی شاہکار تخلیقات سرسید تحریک ہی کی مرہونِ منّت ہیں۔مضمون نگاری بھی سرسید تحریک کی ہی پیداوار ہے۔سرسید تحریک ایک فکری تحریک تھی۔اس تحریک نے روح، جسم، دل اور دماغ کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔یہ سرسید تحریک کا ہی عطیہ ہے کہ فکری سطح پر مشرقی اور مغربی علوم کا انضمام ہو سکا۔اس تحریک نے ماضی، حال اور مستقبل کو ایک دھاگے میں پرونے کا کام بخوبی انجام دیا۔

انجمن پنجاب کی تحریک:

جب قدیم دلی کالج جنگ آزادی کی نذر ہو گیا تو دلی سے ادیبوں کا ایک قافلہ لاہور کی جانب روانہ ہوا۔اس قافلہ میں مولوی کریم الدین احمد، پنڈت من پھول، سید احمد دہلوی الطاف حسین حالی پیارے لال آشوب درگا پرشاد نادر اور محمد حسین آزاد جیسے ادیب شامل تھے ۔ لاہور میں جب گورمنٹ کالج کا قیام عمل میں آیا تو لائٹنر اس کے پہلے پرنسپل مقرر کئے گئے۔لائٹنر ایک صاحبِ بصیرت اور مشرقی علوم سے دلچسپی رکھنے والے مفکر تھے۔انہوں نے لارڈ میکالے کی حکمت عملی کو عملی شکل دینے کی غرض سے ۱۸۶۵ء میں 'انجمن اشاعت مفیدہ پنجاب' کی بنیاد ڈالی ۔جو آگے چل کر 'انجمن پنجاب' کے نام سے مشہور ہوئی اور موجودہ دور میں اسے 'اورینٹل کالج' کے نام سے جانا جاتا ہے۔'انجمن اشاعتِ مطالب مفیدہ پنجاب' کا بنیادی مقصد قدیم مشرقی علوم کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ دیسی زبان میں مغربی علوم کی اشاعت بھی تھا۔ان مقاصد کی تکمیل میں کرنل ہالرائڈ بھی پیش پیش تھے لیکن حقیقتاً اس تحریک کو ایک تحریک کی حیثیت محمد حسین آزاد نے عطا کی ۔فروغِ تعلقات عامہ کے لئے 'انجمن پنجاب' نے ہفتہ وار ادبی جلسے کا آغاز کیا۔ان جلسوں میں خاص وعام دونوں کو شرکت کی اجازت تھی۔ابتدائی جلسوں میں متعدد موضوعات پر مضامین پڑھے جانے کا سلسلہ رہا۔ان مضامین پر آزادانہ اظہار رائے اور بحث کی بھی اجازت تھی۔محمد حسین آزاد کے مضمون کی خوب پذیرائی ہوئی تو انہیں باضابطہ لکچرر مقرر کر دیا گیا۔انجمن کے لکچروں کی ترتیب و تنظیم کی ذمہ داری جب محمد حسین آزاد نے سنبھالی تو انہوں نے جلسے کے اختتام پر نظم جدید کے مشاعروں میں ہیئت کے تجربے بھی کئے اور نظم میں ردیف اور قوافی کو ترک کرنے کا تجربہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ مثنوی کو عشقیہ داستان سے نکال کر فطرت سے قریب تر کرنے کی کوشش بھی کی۔

اس تحریک کو پروان چڑھانے والوں میں محمد حسین آزاد (متوفی ۱۹۱۰ء) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔انہوں نے جدید تنقید کے لئے نئی راہ ہموار کی۔'اردو کی نشوونما اور اصلیت'، 'شمس ولی اللہ'، 'شاہ حاتم' جیسے گراں قدر مضامین لکھے۔جدید نظم کو فروغ دینے کے لئے برسات، زمستان، تہذیب، امید، حب وطن، کے موضوعات پر نظمیں لکھیں۔

'انجمن پنجاب' کی تحریک کو فروغ دینے والی دوسری اہم شخصیت مولانا حالی کی ہے ۔ انہوں نے برسات، امید، رحم وانصاف اور حب وطن کے موضوعات پر نظمیں اور مثنویاں لکھیں۔

تنقید میں 'مقدمہ شعروشاعری' ان کی اہم تصنیف ہے۔حالی اس تحریک سے منسلک ہونے سے قبل سرسید کی تحریک میں بھی سرگرم رکن کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔

اس تحریک کو جلا بخشنے والی ایک اور شخصیت پیارے لال آشوب (متوفی ۱۹۱۴ء) کی ہے۔ یہ 'دلی کالج' کے تربیت یافتہ تھے۔ان کی شخصیت ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی کی صحبت میں پروان چڑھی تھی۔ 'قصص ہند' اور 'رسوم ہند' ان کی معروف تصانیف ہیں۔

مرزا ارشد گورگانی بھی 'انجمن پنجاب' کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔انہوں نے حالی کی نظم 'شکوہ ہند' پر تضمین لکھی جو کافی مقبول ہوئی۔

جدید نظم کی اس تحریک کو فروغ دینے والوں میں اسمٰعیل میرٹھی، شبلی نعمانی اور اکبرالہ آبادی کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ان کے علاوہ میر ناظم حسین ناظم، سیف الحق ادیب، راج نارائن ارمان، مرزا اشرف بیگ وغیرہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

'انجمن پنجاب' کی تحریک نے نظم اور نثر دونوں کو متاثر کیا اور ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کے سبب مضامین اور نظمیں رسائل میں شائع ہوتے تھے جس سے یہ تحریک برصغیر میں دور دراز علاقوں تک پھیل گئی تھی۔

نظم:

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہندوستانی معاشرے پر مغربی تہذیب اور فکر کی ہمہ گیر اور دور رس اثرات مرتسم ہونا شروع ہوئے، اس انقلاب سے قبل نظم کا وہ تصور نہیں تھا جو ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہوا۔جس کا سب سے بڑا محرک انگریزوں کی آمد، مغربی علوم وفنون اور سائنسی انکشافات تھے ۔قدیم دور میں اردو نظم صوری اور معنوی اعتبار سے اپنی ابتدائی حالت میں تھی جو فن کے اعتبار سے بہت زیادہ بلند نہیں کہی جا سکتی تھی۔ جنگ آزادی سے قبل جو نظمیں لکھی گئیں وہ موضوعاتی نظمیں تھیں جن میں علیحدہ موضوعات پر مثلاً: قدرتی چیزوں کو موضوع بنا کر، خیالات قلم بند کئے جاتے تھے۔انقلاب کے بعد جب مغربی اثرات ہندوستانی تہذیب پر حاوی ہو گئے تو ان سے ہمارے بہت سے شعراء متاثر ہوئے اور جدید نظم کی بنیاد ڈالی۔ایسی نظموں میں انگریزی شاعری اور انگریزی نظموں کے خدوخال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ موضوع کی صداقت اور ربط و تسلسل پر زور دیا گیا۔

جدید اردو نظم کے اوّلین علم برداروں میں محمد حسین آزاد کا نام سرفہرست ہے۔آزاد کو اس

بات کا گہرا شعور تھا کہ مغربی تہذیب اور سائنسی علوم کے زیر اثر جو ہندوستان کا نقشہ بدل رہا ہے ان سے ہمیں نظم کا ایک نیا تصور قائم کرنا چاہیے۔ یہ ایک قسم کی روایت سے بغاوت کا اعلان تھا۔ اپنے خیالات کی تکمیل کے لئے آزاد نے 'انجمن پنجاب' کی بنیاد لائٹنر کی ایما پر ڈالی۔ ۱۸۶۷ء میں انہوں نے اپنا معرکتہ الآراء لکچر 'نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات' کے عنوان سے 'انجمن پنجاب' کے پہلے اجلاس میں دیا۔ یہ وہ پہلا لکچر تھا جسے ہم جدید نظم کی ابتدا کا اعلان کہہ سکتے ہیں۔ اس لکچر سے آزاد نے پرانی شاعری کی کمزوریوں اور جدید شاعری کے محاسن کی طرف توجہ دلائی۔ انجمن کے دوسرے اجلاس میں آزاد نے جو مقالے پڑھے وہ بھی نئی نظم کا راستہ ہموار کرنے میں معاون ہوئے۔ انہوں نے مضامین کے علاوہ نظمیں بھی پڑھیں جس میں مناظر فطرت کی تصویر کشی کی اور انگریزی شاعری کی منظری نظموں کو اردو کا لباس پہنایا۔ ان کی نظموں میں ابر کرم ،خواب امن ،معرفت الٰہی ،ایک ستارے کا عاشق ،مشہور ہیں۔

اے ابر آ کہ تو توشہ برشگال ہے　　جو خشک و تر ہے تیرے کرم سے نہال ہے

تیرے عمل کے واسطے رنگِ جہاں ہے اور　　تیری زمیں ہے اور آسماں ہے اور

اے ابر سب یہ سازِ نوا تیرے دم سے ہیں　　یہ لطفِ عیش و لطفِ ہوا تیرے دم سے ہے

مستی میں جھومنا وہ جوانانِ باغ کا　　جھک جھک کے لیتے ہاتھ سے گل کے ایاغ کا

سبزے کے برگ برگ میں موتی جڑے ہوئے　　شاخ و شجر تمام مرصع کھڑے ہوئے

مجموعی طور پر آزاد کی نظمیں یوں تو جدید نظم کی ابتدا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن فنی اعتبار سے ان میں وہ ربط و تنظیم اور معنوی ارتقاء نہیں ہے جو انگریزی کی منظری نظموں کی خاصیت ہے۔ اس کے علاوہ داخلی جوش اور قلبی تاثیر کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے تاہم یہ کہنا بجا ہے کہ آزاد نے جدید نظم نگاری کو ایک نئی کروٹ دی۔

جدید نظم کے تصور کو قائم کرنے والوں میں الطاف حسین حالی بھی صف اوّل میں شامل ہیں۔ حالی نے اپنے عہد کے تقاضوں کو آزاد سے زیادہ جذب کیا تھا۔ ''انجمن پنجاب'' کی تحریک سے جڑنے کے بعد حالی بھی اس کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ انہیں مشاعروں میں انہوں نے برکھارت ،امید، رحم و انصاف ،حب الوطن، جیسی نظمیں پڑھیں۔ یہ نظمیں یوں تو براہ راست مغربی اثرات سے عاری نظر آتی ہیں لیکن بالواسطہ طور پر ان میں مغربی اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

جدید نظم کی بھر پور عکاسی حالی کے ''مقدمہ شعروشاعری'' میں موجود ہیں اس میں شاعری کے نظری اور عملی دونوں نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ حالی کو اس بات کا احساس تھا کہ ہماری روایتی شاعری سچے اور قلبی جذبات کی تصویر کشی کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی نہیں ان میں جھوٹ اور غلو کی بھی زیادتی ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی نظم اور نثر دونوں میں انسان کے سچے جذبات کی تصویر کشی پر زور دیا ہے۔

کیا ہوئے وہ دن اور راتیں   تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا   وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے   گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
تیری اک مشتِ خاک کے بدلے   لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

حالی کی نظمیں فنی اعتبار سے بہت بلند نہیں ہیں لیکن جدید اردو شاعری کے خدو خال کو متعین کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ حالی کی بعض نظمیں جن کا تعلق ان کے دوسرے اور تیسرے دور سے ہے ان میں نظم نگاری کے قابل قدر نمونے ملتے ہیں۔ نظم مناجات بیوہ، چپ کی داد، شکوہ ہند اور مسدس حالی، جدید نظم کے تصور کی بہترین عکاس ہیں۔ حالی کا عطیہ یہ ہے کہ انہوں نے جدید نظم کے ذریعے ظاہری آسائش اور معاملہ بندی کی بالا دستی کو ختم کرنے کی سعی کی اور مغربی طرز شاعری کو اپنی نظموں میں رائج کیا۔

جدید نظم کی روایت آزاد اور حالی نے شروع کی تھی۔ اسے جلا بخشنے والوں میں ان کے معاصر اسمٰعیل میرٹھی بھی ہیں۔ اسمٰعیل میرٹھی ایک مدرس بھی تھے اس لئے انہیں بچوں کی نفسیات اور ان کے عادات واطوار کا گہرا شعور تھا۔ ادب اطفال کو پروان چڑھانے میں اسمٰعیل کی شخصیت بڑی قابل قدر ہے۔ انہوں نے روزمرہ کی زندگی کے واقعات، فطری مناظر، گھریلو اشیاء اور پالتو جانوروں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں جن میں برسات، خدا کی کاری گری، عجیب چڑیا، کتا، گائے، اونٹ، کوّا، چھوٹی چیونٹی، ایماندار لڑکا، وغیرہ بڑی مشہور نظمیں ہیں ۔ یہ نظمیں بچوں کی علمی استعداد کو سامنے رکھ کر لکھی گئیں ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے اخلاقی درس دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظمیں جدید نظم نگاری کے تقاضہ کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوئیں۔

ارے چھوٹے چھوٹے تارو
کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہووے
مجھے کس طرح تحیر
کہ تم اونچے آسماں پر
جو ہے کُل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے
کہ کسی نے جڑ دیئے ہیں
گہرا ور لعل گویا

اکبر الہ آبادی کی شہرت اور مقبولیت ان کے اعلیٰ منصب کے سبب نہیں ہوئی بلکہ ان کی شاعری کے سبب ہوئی۔ ان کی شاعری میں شوخی اور ظرافت کے ایسے گل بوٹے موجود ہیں کہ انہیں اپنے طرز کا موجد اور خاتم قرار دیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں طنز و مزاح کا ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جو دل کو چھوتا ہے۔ اسی طرز خاص کے سبب انہیں جدید اردو نظم میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں سماجی عیوب اور مغربی تہذیب کی پیروی کو طنز و مزاح کے ذریعے بے نقاب کیا ہے۔ اکبر مشرقی آداب زندگی کے قائل تھے۔ وہ اپنے ماضی کی روایت کو فراموش کر کے مغربی آداب زندگی کو کسی طرح قبول کرنے کو راضی نہیں تھے۔ اس لئے ان کی نظموں میں ہندوستانی تہذیب کی عظمتوں کا اعتراف اور مغربی تہذیب پر اعتراض ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے اصلاح قوم کی ذمہ داری نبھائی۔ برق کلیسا، جلوہ دربار دہلی، آمد بہار مس وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ جنہیں خاص ہندوستانی سیاق میں لکھا گیا ہے۔

سر میں شوق کا سودا دیکھا
دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا؟
جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا
اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
خیموں کا اک جنگل دیکھا
اس جنگل میں منگل دیکھا
کچھ چہروں پر مردی دیکھی
کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی
دل نے جو حالت کردی دیکھی

جدید نظم کی توسیع علامہ شبلی نعمانی کے ذریعے بھی ہوئی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کی طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ علی گڑھ سے وابستہ ہونے کے سبب انہوں نے اسلامی علوم و فنون کی تحقیق میں وقت صرف کیا لیکن نظم کے جو نمونے انہوں نے پیش کئے وہ جدید نظم کی تحریک کو

فروغ دینے میں کافی معاون ہوئے۔شبلی نظم کے نئے تصور اور نئے تقاضوں سے آشنا تھے۔ان کے سامنے حالی کی جدید منظومات تھیں۔شبلی کی نظموں کے موضوعات آزاد اور حالی کی بہ نسبت محدود ہیں۔ان کی نظموں میں زیادہ تر مسلمانوں کے موجودہ تنزل اور پستی کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں میں اس عہد کے سیاسی واقعات پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔ان کی نظموں میں دردمندی، جوش اور خلوص موجود ہے۔شبلی نے اپنے عہد کی نفسیاتی ضرورتوں کو بھی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔'صبح امید' اسی ذیل کی نظم ہے۔اس کے علاوہ نظام حکومت، اسلام، مذہب، ہمارا طرز حکومت، مساوات اسلام، وغیرہ قابل ذکر نظمیں ہیں۔

کچھ نوجوان ہیں بے خبر نشۂ شباب　　ظاہر میں گرچہ صاحب عقل وشور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ　　مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینے پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار　　از بسکہ مست بادۂ ناز وغرور ہیں

گرچہ شبلی کی بہترین نظموں کی تعداد قلیل ہے لیکن یہ نظمیں جدید نظم نگاری کی تاریخ میں اپنا الگ مقام رکھتی ہیں۔ان کی نظموں میں ہیئت اور اسلوب کے لحاظ سے زور اور صفائی ملتی ہے۔ان کی نظموں میں دل کا اضطراب بھی ہے اور دل کی شوخی بھی۔

انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی کی ابتدا میں جدید نظم نگاری کے تاریخی اور فنی ارتقاء میں علامہ اقبال کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔انہوں نے نظم کو نہ صرف جدید تعمیر وتشکیل، فنی پختگی اور نئی آگہی سے روشناس کرایا بلکہ جدید عہد کے تصورات کی وسعتوں اور نئی فکری ومعنوی بلندیوں سے بھی آشنا کرایا۔اقبال نے جدید نظم نگاری کو اپنی نظموں کے ذریعے فنی حسن، توانائی اور جدت عطا کی۔یہی سبب ہے کہ انہیں اپنے عہد میں ایک منفرد مفکر کی حیثیت سے شہرت ملی۔فن اور موضوع کی جدت کے لحاظ سے یوں تو اقبال کی نظمیں حالی اور آزاد کی قائم کردہ روایت سے مختلف ہیں لیکن جدید نظم نگاری کے فطری تقاضوں کو یا اس عہد کے خیالات کو بہت حد تک پیش کرتی ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اقبال جدید نظم کی تحریک سے متاثر تھے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے　　تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا　　جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر وحرم کو چھوڑا　　واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑا ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے　　خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے   دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

۱۹۰۱ء میں 'مخزن' رسالے کی اشاعت ہوئی۔ اس رسالے کو اردو جدید نظم نگاری کی ارتقائی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے پہلے ہی شمارے میں اقبال کی نظم 'ہمالیہ' شائع ہوئی جو ان کے فکر و تخیل کی بلندی، مشاہدے کی تازگی اور فنی حسن کو پیش کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اقبال نے اپنی نظموں میں فکری وحدت کے تصور پر زور دیا تھا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں خیال اور جذبے کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ ارتقاء اور تعمیر کا خیال بھی رکھا ہے۔ ان کی ابتدائی نظموں میں عشق اور موت، پیام صبح، رخصت اے بزم جہاں، حسن اور زوال، آفتاب وغیرہ شامل ہیں۔

غزل:

غزل کی جو روایت ۱۸۵۷ء تک بڑے دھوم دھام سے چلی آ رہی تھی اس ہنگامہ آزادی کے بعد آہستہ آہستہ زوال پذیر ہوتی گئی۔ ایک نئے تقاضے اور ضرورتوں نے غزل کے بجائے نظم نگاری کو فروغ دیا۔ غزل یوں تو متعدد ادوار میں بے شمار تغیرات سے گزرتی رہی لیکن داغ سے حسرت کے درمیان جو عبوری دور ہے اس میں غزل نگاری نیم جان سی ہو گئی تھی۔ بغور دیکھا جائے تو یہ غزل کے خلاف پہلی بغاوت تھی۔ اس دور میں علم و ادب اور آرٹ کے قدیم نظریات پر جدید تصورات کا حملہ ہو رہا تھا اور یہ احساس پھیل رہا تھا کہ جدید شعر و ادب میں زندگی کے ماوی حقائق کو بھی پیش کیا جانا چاہیے۔ ان خیالات کے اظہار کے لئے تسلسل کی ضرورت تھی اور غزل اس ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر تھی۔ چنانچہ غزل نگاری سے انحراف کرتے ہوئے نظموں میں ان حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس زمانے میں حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' میں غزل پر اعتراضات کر کے غزل نگاری کو اور مشتبہ بنا دیا۔ ان تمام رجحانات کے باوجود چند شعرا موجود تھے جن کے سینے میں اب بھی غزل کی شمع ٹمٹما رہی تھی۔ آندھی میں چراغ جلانا آسان نہیں ہوتا تاہم چند شعرا نے غزل کی روایت کو سینے سے لگایا اور 'وفاداری بشرط استواری' کی مثال قائم کی۔ ان شعرا کے سامنے محمد حسین آزاد اور حالی کی جدید نظم کی تحریک سینہ سپر تھی مگر غزل مخالف تحریک کے باوجود پرانی روایت کو زندہ رکھنے میں شعرا کو کامیابی ملی۔

نواب مرزا داغ دہلوی کی پرورش لال قلعہ میں ہوئی تھی اور انہیں ذوق کی شاگردی کے ساتھ ساتھ زمانے کے مشہور شاعر شیفتہ، صہبائی اور ظفر، کی صحبت بھی حاصل تھی۔ اس لئے ان کی غزلوں میں تعیش پسندی کے اثرات غالب ہو گئے۔ ان کی تمام غزلیں عیش و نشاط میں ڈوبی ہوئی

ہیں۔۱۸۵۷ء میں جب قلعہ معلّٰی کا شیرازہ بکھر گیا تو داغ، نواب یوسف علی خاں کی سرپرستی میں رام پور چلے گئے۔ پھر ۱۸۸۶ء میں دکن کا رخ کیا۔ داغ کی غزلوں میں کہیں کہیں زوال آمادہ معاشرے کی جھلک بھی ملتی ہے لیکن ان کی غزلیں جذبات پرستی، بولہوسی اور لذت پرستی سے عبارت ہیں۔ ان کی غزلوں میں محبوب کا تصور بازاری عورت کے طور پر ابھر کر آتا ہے۔ ان کے یہاں محبوب سے محبت، لگاوٹ اور شکوہ شکایت کی جو سطح ہے وہ معیاری نہیں ہے اور یہ سب کچھ جو ان کی غزلوں میں ملتا ہے وہ قلعہ معلّٰی کی پرورش اور عیش ونشاط کا نتیجہ ہیں۔

ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا   پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا

نہ مزا ہے دشمنی میں نہ ہے لطف دوستی میں   کوئی غیر غیر ہوتا کوئی یار یار ہوتا

اس زوال آمادہ دور میں غزل کو سینے سے لگائے رکھنے والے غزل نگاروں میں امیر مینائی بھی شامل ہیں۔ ان کی پرورش لکھنؤ کے ماحول میں ہوئی تھی۔ داغ کی طرح یہ بھی رام پور منتقل ہو گئے اور نواب رام پور کے یہاں مفتی مقرر ہوئے۔ امیر مینائی علمی طور پر داغ سے برتر تھے لیکن داغ کے رنگِ تغزل کو دیکھ کر انھوں نے بھی وہی رنگ اختیار کیا۔ اس طرح ان کی غزلوں میں بھی جذباتی اور حسی کیفیتوں کی پیش کش ملتی ہے لیکن ان کی غزلوں میں عامیانہ پن نہیں ہے جو داغ کے یہاں نمایاں ہو گیا ہے۔ ان کے یہاں ایک تہذیبی وقار قائم ہے۔ زبان و بیان کی آرائش اور تشبیہ واستعارے سے پُر ہے۔ ان کی غزلوں میں عشقیہ موضوع کے علاوہ تصوف اور اخلاق کے مضامین بھی باندھے گئے ہیں۔

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں   میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

فنا کے بعد ایسے بےکسوں کو کون پوچھے گا   مگر اے بےکسی رویا کرے گی مجھ کو تُو

برسوں

ضامن علی جلال کی نشوونما لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ناسخ اور آتش اور ان کے شاگردان کا بڑا بول بالا تھا۔ جلال دونوں دبستانِ فکر سے متاثر ہوئے اور اپنی غزلوں میں دونوں کے رنگ کو سمویا۔ ان کی غزلوں میں عشق کے موضوع لکھنوی انداز میں ظاہر ہوئے ہیں۔ مضمون آفرینی ان کی غزلوں میں روح، سادگی اور تازگی پیدا کرتی ہے۔ اردو غزل کی روایت کو زندہ رکھنے والوں میں جلال کی خدمت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کمی کس کی طرف سے پائی جاتی ہے محبت میں   ہم اپنے دل سے پوچھیں آپ اپنی کم نگاہی سے

رہتا ہے کلیجے میں نہاں دردِ محبت   یہ چوٹ وہ ہے جس کو اُبھرنا نہیں آتا

الطاف حسین حالی اردو ادب میں کئی حیثیتوں سے پہچانے جاتے ہیں ان میں ایک پہلو غزل گوئی بھی ہے ۔حالی کے مختصر دیوان میں ۱۱۳ غزلیں ہیں جن میں ان کے ذہنی اور اخلاقی تبدیلیوں کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں ۔ان کی ابتدائی غزلیں اثر اور تاثیر سے لبریز ہیں لیکن جیسے جیسے حالی اصلاحی خیالات سے متاثر ہوتے گئے ان کی غزلوں میں تاثر اور تغزل کم ہوتا گیا۔ان کی بعض غزلوں پر مرثیت کا رنگ بھی غالب آ گیا ہے۔ان کے یہاں غالب کی نسبت شیفتہ اور مومن کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں ۔اپنے اصلاحی مقاصد کو انہوں نے غزلوں میں بھی پیش کیا ہے۔جن میں دور ماضی کی یاد اور مستقبل کے امکانات کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے ۔ان کی غزلیں پیچیدگی سے پاک ہیں ۔دل کی باتوں کو معصومانہ صداقت اور سادگی سے پیش کرتے ہیں ۔ان کی غزلوں میں جام و مینا سے احتراز ہے۔تشبیہہ اور استعارے بھی بہت کم ہیں ۔روزمرہ اور محاورات کی کثرت ملتی ہے۔

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ دل کا پوچھا   بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی   دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

عام روایتی خیالات کے اعتبار سے یوں تو غزل کا تاریخی سلسلہ داغ دہلوی پر ختم ہو جاتا ہے لیکن اس سلسلے کو ہمارے چند شعرائ نے زندہ رکھنے کی بھرپور کوشش کی ۔ان میں سید علی محمد شاد عظیم آبادی (متوفی ۱۹۲۷ء) کا نام قابلِ قدر ہے۔انہوں نے تمام مروجہ اصناف میں شاعری کی لیکن مرثیہ اور غزل میں زیادہ شہرت پائی۔ان کا سلسلۂ تلمذ شاہ الفت حسین فریاد کی نسبت سے خواجہ میر درد تک پہنچتا ہے۔شاد کی غزلوں کا خمیر فلسفۂ تصوف سے اٹھا ہے۔انہوں نے غزل کے پیرائے میں ان بلیغ اور معنی خیز فکر کو پیش کیا ہے جس کی ابتدا خواجہ درد نے کی تھی ۔شاد کی غزلوں میں غم اور خوشی کا متوازن انداز، پاکیزہ حسن و عشق ،رزم و بزم کی دلکش روداد اور اخلاق کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو شاد، درد سے زیادہ میر کے قریب نظر آتے ہیں ۔ان کی غزل معنوی اعتبار سے روایت شکن بھی تھی کیوں کہ ان کے عہد کی غزلیہ شاعری عامیانہ حسن و عشق کے دائرے میں مقید تھی لیکن انہوں نے اپنی غزلوں کو ان سے دور رکھا اور فکری احساسات

کے دائرے کو پھیلانے کی کوشش کی۔ 'نغمۂ الہام' جوان کا دیوان ہے، میں زمانے کی روداد بھی ہے، دل کی کہانی بھی ہے اور فکر کی سربلندی بھی ہے۔ ان کی زبان و بیان میں ایک رکھ رکھاؤ موجود ہے جو انہیں اپنے معاصرین سے منفرد کرتا ہے۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی   نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

طنز و مزاح کے شاعر ہونے کے سبب اکبرالہ آبادی اردو دنیا میں ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ انہوں نے نظم اور غزل دنوں میں برابر بے تکلف جذبات نگاری کی ہے۔ اکبر اس دور میں جب کہ غزل زوال پذیر تھی اسے زندہ رکھنے میں پیش پیش رہے۔ انہوں نے طنز و مزاح، رمز و ایما اور اشارات و علامات سے غزل کو ایک نئی نہج پر پہنچایا۔ زمانہ شناسی اور جدت طرازی کے ساتھ ساتھ انہوں نے وقت کے اہم مسائل اور زندگی کے نشیب و فراز کو اپنی غزلوں میں اس طرح پیش کیا کہ اردو غزل افادیت اور مقصدیت کی طرف مائل ہوگئی۔ ان کی غزلوں میں تنقید حیات بھی ہے اور آئینۂ کائنات بھی۔ ان کی غزلیں نئی زندگی، نئے شعور اور نئی تب و تاب سے لبریز ہیں۔ اس دور میں غزل کی آبرو کو برقرار رکھنے والوں میں اکبر کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

زخمی نہ ہوا تھا دل ایسا، سینے میں کھٹک دن رات نہ تھی
پہلے بھی ہوئے تھے کچھ صدمے روئے تھے مگر یہ بات نہ تھی
جب یاس ہوئی تو آہوں نے سینے سے نکلنا چھوڑ دیا
اب خشک مزاج آنکھیں بھی ہوئیں دل نے بھی مچلنا چھوڑ دیا

علامہ اقبال اس عہد کے سب سے زیادہ مقبول و معروف شاعر ہیں۔ نظم میں زیادہ نام پیدا کیا لیکن ان کی غزلیں اس دور کے ذہن کو متاثر کرنے میں بہت کامیاب ہوئیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۸۹۳ء میں کیا اور ارشد گورگانی و داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ قرآن کریم اور احادیثِ نبویؐ کو اپنا ماخذ بنایا اور غزل کو ایک ایسی زبان عطا کی جس کی مثال نہ قبل ملتی ہے اور نہ بعد کو۔ غزل کے داخلی آہنگ کو رومانی فکر سے مترنم بنایا اور فکر و فلسفہ سے ان میں معنی خیزی پیدا کی۔ انہوں نے اپنی فکر کو متضاد رویوں کے تصادم سے تقویت دینے کی کوشش کی

مثلاً :۔ مردِ مومن اور ابلیس، عقل اور عشق، جنت اور جہنم، خودی اور بے خودی وغیرہ۔ ان کی غزلوں کا داخلی جہان بہت وسیع ہے۔ مسلسل غزلوں کی کیفیت نظم سے بہت قریب ہوگئی ہے۔

موضوع کے اعتبار سے اقبال نے پرانی روایت پر انحصار نہیں کیا بلکہ نظریۂ حیات کے اظہار کے لیے ایک نئے پیرائے کا انتخاب کیا اور ایسے شعری کردار تراشے جو ظاہری خصائص سے کہیں زیادہ باطنی اوصاف کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی غزلوں میں بھی علامتی انداز نمایاں ہوگیا ہے۔ اقبال کے ہاں لیلیٰ کا کردار حسن و عشق کا مجسم پیکر بن کر نہیں ابھرتا بلکہ عشق کی منزل کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ اسی طرح ان کے ہاں مجنوں کا کردار تلاش و جستجو کی علامت بن گیا ہے۔ فرہاد کا کردار سعیِ پیہم اور ابلیس کا کردار بغاوت کی علامت بن گیا ہے۔

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ مَیں سمجھا
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

ناول:

داستان گوئی کا ابھی عہد شباب ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے زندگی کے آداب بدل دیے۔ ہندوستان پر مغربی تعلیم و تہذیب کے اثرات بڑی تیزی سے حاوی ہوتے جا رہے تھے۔ اسی تیزی سے مشرقی ادب انہیں قبول بھی کر رہا تھا۔ ادب کی اس تبدیلی نے ہندوستان کو حقیقت سے قریب تر کر دیا اور اس طرح ناول نگاری کا وجود اردو میں ہوا۔ جمہوریت کا بڑھتا ہوا رجحان، مختلف بندشوں سے آزاد ہونے کی تمنا اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ردعمل، ناول نگاری کی پیدائش کا سبب بنا۔ یہ زمانہ چونکہ اصلاح کا زمانہ تھا اس لئے ابتدا میں جو ناول لکھے گئے وہ اصلاحی موضوعات سے قریب تھے۔ اس زمانے میں عورتوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی جا رہی تھی۔ یہ رجحان بھی ناولوں کے موضوع بنے۔

نذیر احمد نے اردو میں ناول نگاری کا آغاز کیا اور 'مراۃ العروس' کے نام سے پہلا ناول ۱۸۶۹ء میں لکھا۔ انہوں نے اردو ناول نگاری کو بعض ایسی صحت مند اور مستحکم روایات بخشی جس سے آج بھی اردو ناول مستفید ہو رہا ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں 'بناۃ النعش'، 'توبۃ النصوح'

’فسانہ مبتلا‘، ’ابن الوقت‘ وغیرہ مشہور ہیں۔ان تمام ناولوں میں زمانے کی مختلف سماجی حقیقت، ان کی خرابیاں اور ان کی اصلاح کے حل پیش کئے گئے۔ان ناولوں میں سماجی زندگی اور زمانے کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔نذیر احمد کے ناولوں کا مقصد انسان کے فکر وخیالات کو تبدیل کرنا اور انسانی زندگی کو بہتر بنانا تھا۔انہوں نے اپنے ناولوں کے کرداروں کی نفسیاتی پیش کش جس انداز سے کی ہے اس سے ان کی نفسیاتی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

نذیر احمد کے زمانے میں ناول نگار کی حیثیت سے سرشار کو بھی کافی مقبولیت حاصل ہے۔ گرچہ انہوں نے اپنے ناولوں میں خصوصاً لکھنؤ اور لکھنؤی معاشرے کو پیش کیا ہے لیکن ایسی مکمل اور جامع تصویر کشی کی ہے کہ یہ پورے زمانے کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ان کے ناولوں میں جامِ سرشار، سیر کہسار، کامنی، شمس الضحیٰ، وغیرہ مشہور ہیں لیکن جس ناول نے سرشار کو حیات جاوداں بخشی وہ ’فسانہ آزاد‘ ہے۔اس ناول کا ایک اہم کردار خوجی ہے جو کئی حیثیتوں کا حامل ہے اور ایک پوری تہذیب کی علامت بن گیا ہے۔

سجاد حسین انجم کسمنڈوی ان ناول نگاروں میں سے ہیں جن پر بہت کم توجہ دی گئی ہے بلکہ بعض وقت انہیں ناول نگار ہونے سے ہی خارج کر دیا جاتا ہے ۔ان کا ایک ناول ’نشتر‘ ہے جو بہت اہم ہے۔ان کے ساتھ ایک ستم ظریفی یہ بھی ہوئی کہ ان کی ایک مزاحیہ تصنیف ’حیات شیخ چلی‘ کو دوسرے مصنف سے منسوب کر دیا گیا۔’نشتر‘ کے علاوہ ’کائنات‘ بھی ان کا ایک اہم ناول ہے۔ غالباً انجم پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے ناول کو آپ بیتی کے انداز میں لکھا ہے۔انجم کے ناولوں میں کرداروں کو بڑے سلیقے سے سجایا گیا ہے۔ناول کا موضوع عموماً عشقیہ ہے لیکن کردار اور زبان و بیان بالکل فطری ہیں۔ان کے ناولوں میں جذبات انسانی کی بڑی خوبصورت تصویر کھینچی گئی ہے اس لحاظ سے اردو ناول نگاروں میں انہیں انفرادیت حاصل ہے۔

اردو ناول نگاری کی ابتدائی روایت کو فروغ دینے والوں میں منشی سجاد حسین بھی قابل ذکر ہیں۔’اودھ پنچ‘ میں شائع ہونے والے ان کے ناولوں میں اس عہد کے واقعات کا بھرپور شعور ملتا ہے۔ان کے ناول سنجیدہ ہیں لیکن بعض جگہ طنز و مزاح کا نشتر بھی چلتا نظر آتا ہے۔ان کے ناولوں کے کردار عموماً مزاحیہ ہیں مثلاً: ’حاجی بغلول‘ اور ’احمق الدین‘۔منشی سجاد حسین کے معروف ناولوں میں ’طرح دار لونڈی‘، ’پیاری دنیا‘، ’میٹھی چھری‘، ’کایا پلٹ‘ وغیرہ مشہور ہیں۔منشی سجاد حسین

غالباً پہلے ناول نگار ہیں جن کے ناولوں میں برطانوی حکومت کے استبداد کو واضح طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان کے ناولوں میں اس عہد کی سیاسی فضا بھی صاف نظر آتی ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ناول نگاری کی جو روایت شروع ہوئی تھی ان کو آگے بڑھانے میں قاضی سرفراز حسین عزمی بھی ہیں۔ان کے کئی ناول مثلاً: 'سعید'، 'بہارعیش'، 'خمارعیش'، 'سرابِ عیش'، 'سزائے عیش'، وغیرہ منظر عام پر آئے لیکن جس ناول سے انہیں شہرت ملی وہ 'شاہد رعنا' ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں طوائف اور طوائف کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ان کے ناول ہیئتی اعتبار سے ڈرامائی ہیں۔واقعات کی ترتیب اور مکالموں میں جامعیت اور روانی ہے۔بعض جگہ نفسیاتی عوامل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔مجموعی حیثیت سے ان کے ناولوں میں ایک خوش مزاجی نمایاں ہے۔رسوا کا مشہور ناول 'امراؤ جانِ ادا' انہیں کے ناول 'شاہد رعنا' کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

ایک ناول نگار کی حیثیت سے آغا شاعر قزلباش بھی مشہور ہوئے۔ان کے ناولوں میں 'نقلی تاج دار'، 'ہیرے کی کنی'، 'ناہید' اور 'ارمان'، قابلِ ذکر ہیں۔اس دور کے دوسرے ناول نگاروں کی طرح آغا شاعر سے بھی بے توجہی برتی گئی۔گرچہ ان کے ناولوں میں ماحول اور اس کے شعور کا اتنا گہرا اثر موجود نہیں ہے اس کے باوجود اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ان کے ناول حالانکہ مختصر ہیں لیکن کرداروں کا جس خوبی سے ارتقاء انہوں نے پیش کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ان کے ناولوں میں 'شعور کی رو' کی تکنیک کو خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

تنقید:

برطانوی اقتدار کے قیام اور مداخلت سے ہندوستان کا شہنشاہی دورِ حکومت رو بہ زوال تو ہو گیا مگر علومِ مغربیہ کی شعاعوں نے ہمارے ذہنی نہج کو جو معراج بخشا وہ اردو زبان کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے جسے کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔فورٹ ولیم کالج اور دلّی کالج کے قیام کے بعد مغربی علوم سے استفادہ کرنے کا رجحان عام ہوا تو مغربی علوم سے شغف رکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد مغربی علوم کی طرف مائل ہوئی اور جب اس علومِ جدیدیہ سے ذہنوں کو منور کرنے کی تلقین کی تو ہر سطح پر اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔بعضوں نے اپنے دامن سمیٹ لیے اور کچھ نے اسے نئی بشارت سمجھ کر گلے سے لگا لیا۔سرسید احمد خاں انہیں میں سے ایک تھے جنہوں نے

انگریزی تعلیم کی پیروی کی اور ایک نئی تحریک کا آغاز کیا۔ سرسید کی تحریک جسے علی گڑھ تحریک سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، بنیادی طور پر ہندوستانی سیاق وسباق میں مغربی علوم کے احیا کی تحریک تھی۔ یہ پورا دور ہر شعبے میں اصلاح کی ضرورتوں کو محسوس کر رہا تھا۔ سرسید اس تغیرِ زمانہ کو سمجھ چکے تھے اس لیے انہوں نے باضابطہ تو نہیں مگر بیشتر جگہ اپنے موقف کا اظہار کیا اور شعر وادب میں نئے افہام کی ضرورت کو محسوس کیا۔ انہوں نے مغربی علوم سے استفادہ کرنے اور ان کی روشنی میں شعر و ادب کا جائزہ لینے کی تلقین کی۔ اپنے متعدد مضامین اور دیگر تصنیفات میں خود بھی اظہارِ خیال کیا۔ حالانکہ ان کے خیالات ان کی تحریروں میں اس قدر منتشر ہیں کہ اگر ان سے مجموعی تاثر اخذ کیا جائے تو بلاشبہ یہ جدید تنقید کے باوا آدم قرار پائیں گے۔ شعر وادب کے حوالے سے سرسید کے خیالات مشرقی ومغربی علوم کے امتزاج کا نتیجہ ہیں۔ اس کے علاوہ حالی اور شبلی جنھیں اردو تنقید کا ستون سمجھا جاتا ہے، نے خود سرسید کی ہی نگرانی میں اپنی علمی و ادبی استعداد کی تراش خراش کی تھی۔ حالی اور شبلی کی موضوعاتی نظموں اور مثنویوں پر سرسید نے جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے اور جس طرح انہوں نے بار بار نیچرل شاعری اور مغربی شعر وادب سے استفادہ کرنے اور ان سے ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے کی ہدایت کی ہے، ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ آئندہ آنے والے زمانے میں یہی طرز اور یہی فکر سکّہ رائج الوقت قرار پانے والا ہے۔ سرسید کی اس دوررس اور دور بیں نگاہوں کا ہی نتیجہ ہے کہ ہمیں حالی اور شبلی جیسا عظیم ناقد اور ادیب ملا۔

سرسید کی تحریک سے الگ 'انجمن پنجاب' کی تحریک بھی سرگرم عمل تھی جو اپنے پیمانے اور خاص طریقے سے شعر وادب کی آبیاری کر رہی تھی اور جس کے روح رواں محمد حسین آزاد تھے۔ محمد حسین آزاد کو صاحب بصیرت لائٹنر کی سرپرستی حاصل تھی۔ انہیں کی ایما پر انہوں نے پہلے ادبی جلسے اور پھر مشاعرے منعقد کرنے شروع کئے جو بہت کم وقتوں میں اس قدر مقبول ہوئے کہ حالی اور شبلی بھی اس کے رکن بن گئے۔ یہ 'انجمن پنجاب' کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ شعراء حضرات مجتمع ہو کر انگریزی کی نظموں کے طرز پر موضوعاتی نظمیں پڑھنے اور لکھنے لگے اور نیچرل شاعری کے عناصر کو اپنی شاعری میں سمیٹ کر پیش کرنے لگے۔ محمد حسین آزاد نے اسی ادبی جلسے میں ۱۸۶۷ء میں ایک لکچر 'نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات' کے عنوان سے دیا اور نئی طرز فکر کی طرف

معنی خیز اشارے کئے۔ اس کے علاوہ ’مقدمہ نظمِ آزاد‘، ’سخندانِ فارس‘ اور ’آبِ حیات‘ میں اپنے تنقیدی موقف کا اظہار کیا۔ ’آبِ حیات‘ محمد حسین آزاد کے تنقیدی نظام کا نقطۂ عروج ہے۔ اسی ’آبِ حیات‘ سے آزاد کی حیثیت بھی متعین ہوتی ہے۔ یہ جہاں ایک طرف انہیں نقاد بناتی ہے وہیں دوسری طرف انہیں ایک محقق اور ایک انشا پرداز بھی ثابت کرتی ہے۔ آزاد کے تاثراتی اور جمالیاتی نظام فکر میں تاریخ و تہذیب کا امتزاج بھی نمایاں ہے اور اسلوب بیان کی انفرادیت بھی قائم ہے۔ مثلاً اردو زبان کی ابتدا کے حوالے سے فرماتے ہیں:

”اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے
نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔“

جب نظم اور نثر کے ظہور پر اظہارِ خیال کرتے ہیں تو کہتے ہیں:

”زبان اردو کے ظہور پر خیال کریں اور اس کی تفصیلات پر نظر
ڈالیں تو اس میں نثر سے پہلے نظم نظر آئے گی۔“

اور جب ان دونوں اصناف کے فرق کی وضاحت کرتے ہیں تو لکھتے ہیں:

”نظم اور نثر میں فرق یہ ہے کہ نثر کی عقلی نوعیت تجزیاتی ہوتی ہے
اور اس کا کام تشریح یا کیفیت کا بیان کرنا ہے۔ اس کے برعکس نظم
تخیّلی اور ترکیبی ہوتی ہے۔ یعنی مختلف عناصر میں ربط اور تعلق
پیدا کرتی ہے۔“

فصاحت کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم، کسی شئے پر رغبت یا اس
سے نفرت، کسی شئے سے خوف یا خطرہ یا کسی شئے پر قہر یا غضب
،غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو اس کے بیان سے وہی اثر،
وہی جذبہ، وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے۔ جو
اصل کے مشاہدے سے ہوتا۔“

اس طرح محمد حسین آزاد نے ادبی تنقید کی ابتدائی جہت متعین کرنے کی کوشش کی اور جو منشور پیش کیا وہ ہر چند کہ جدید تحقیق و تنقید کی رو سے کمزور ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان خیالات

سے آزاد کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔

یہ پہلا موقعہ تھا جب محمد حسین آزاد نے اپنی تنقیدی رائے سے ایک نئی فکری کوشش اردو شعرو ادب میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح محمد حسین آزاد نے اردو تنقید کے لئے ایک نیا راستہ ہموار کیا جس پر چل کر حالی اور شبلی نے پھر ان کے بعد بہت سے ناقدین نے اس روایت کو زندہ رکھا۔ محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں تنقید کے بہت سے گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ سرسید کے بعد محمد حسین آزاد ہی ہیں جنہوں نے مغربی اثرات کو پہلے پہل اپنی تحریروں میں پیش کیا اور اس کے افادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ حالانکہ مغربی علوم سے گہری واقفیت محمد حسین آزاد کو نہیں تھی مگر تراجم اور انگریزی داں حضرات کے وسیلے سے جو کچھ یا جہاں تک انہوں نے سیکھا تھا اسے پیش کرنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ اس عدم واقفیت کے سبب ان کی تنقید نقائص سے پُر ہیں مگر یہ بات اپنی جگہ کم اہمیت کی حامل نہیں کہ جس جدید تنقیدی فکر تک ہم نے رسائی حاصل کی ہے اس تک پہنچنے کی راہ پہلے پہل دکھانے والوں میں محمد حسین آزاد کی خدمت کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

محمد حسین آزاد کے بعد جس نے تنقید کی تعمیر میں نمایاں کام انجام دیا وہ الطاف حسین حالی ہیں۔ حالی کی ذہنی وفکری تربیت سرسید کے زیرِ سایہ ہوئی تھی جسے 'انجمن پنجاب' کے ہیرو محمد حسین آزاد کی صحبت میں مزید تقویت ملی۔ حالی ایک عالمانہ اور خلاقانہ ذہن رکھتے تھے اس لیے مغربی فکر کو جذب کرنے میں دیر نہیں کی۔ کرنل ہالرائڈ نے مغربی ادبیات کے تراجم اور مطالعہ کی طرف ان کا ذہن نشیں کرایا تو ان کے تنقیدی شعور کو مزید جلا ملی۔ ۱۸۹۳ء میں جب انہوں نے اپنا دیوان شائع کیا تو اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا جس میں شعروشاعری کے مشرقی ومغربی مصادر کے امتزاج کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ اس مباحث کے پسِ پردہ ان کا مقصد اپنی شاعری کے اثبات کے لیے ایک جواز فراہم کرنا تھا۔ جسے انہوں نے ورڈز ورتھ کے 'لیریکل بیلاڈز' پر لکھے گئے مقدمہ سے متاثر ہوکر لکھا تھا۔ بعد میں یہی مقدمہ علاحدہ طور پر 'مقدمہ شعروشاعری' کے نام سے شائع ہوا اور اردو تنقید کی باضابطہ پہلی کتاب یا منشور قرار پایا۔ اس مقدمہ میں حالی نے شعروشاعری کے اصول وضع کئے اور نظری وعملی تنقید کے نمونے پیش کئے۔ ابتداً اس تنقید پر بہت لعن طعن ہوئی اور اس کا خوب مزاق اڑایا گیا لیکن ہنسی کے اس ماحول کو مقدمہ کے فکر انگیز خیالات نے بہت جلد اپنے قبضے میں لے لیا اور ہر خاص وعام کو سوچنے پر مجبور کردیا۔ 'مقدمہ شعروشاعری' کے علاوہ حالی

نے اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار 'یادگارِ غالب'، 'حیاتِ سعدی' اور 'حیاتِ جاوید' میں بھی کیا اور شعر وشاعری کے بنیادی اصولوں کو مبرہن پیش کیا۔

عام طور پر اب تک شعر وادب کو مسرت بہم پہنچانے کا ہی ذریعہ سمجھا جاتا تھا مگر حالی نے اس کی تردید کی اور اس کی مقصدیت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شعر وادب کے داخلی محرکات سے بخوبی آشنا تھے اس لیے انہوں نے شاعری کو ایک ایسا آلہ قرار دیا جس سے زندگی کو بہتر بنایا جاسکتا ہے ۔انہوں نے اخلاق کی درستگی میں بھی شاعری کو ہی اوّلیت کا درجہ دیا۔ حالی نے مغربی تنقید کے بیشتر مباحث کو اپنی تحریروں میں پیش کیا اور جن امور میں اختلاف کی گنجائش نظر آئی وہاں اس کی تردید کی اور جہاں فکر انگیز درک نظر آیا اس کا استقبال کیا۔ حالی نے لفظ و معنی کے رشتوں کو بھی اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے حالانکہ ان کا رجحان معنی کی طرف زیادہ نظر آتا ہے مگر انہوں نے دونوں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ حالی نے مغربی نقادوں کے نظریات کو از سرِ نو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ جان اسٹوارٹ مِل نے ورڈز ورتھ پر لکھے اپنے مضمون میں شاعری کے اخلاقی پہلو کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس سے متاثر ہو کر حالی نے مِل کے اس نظریے کو اردو میں منتقل کیا اور اسے اپنی شاعری میں پیش کیا۔

تخیل کے نظریہ کو بھی حالی نے شاعری کے لئے ضروری خیال کیا ہے۔ یہ نظریہ بھی انہوں نے ارسطو کے نظریے سے اخذ کیا ہے اور کولرج کے نظریہ تخیل کی تائید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ ایک ایسی قوت ہے جو تجربے اور مشاہدے کو ترتیب دیتی ہے۔ حالانکہ حالی نے جس انداز سے تخیل کی تعریف وتحسین کی ہے اس سے تخیل اور فنطاسی کا نظریہ گڈمڈ ہو گیا ہے مگر چونکہ اس بحث کو پہلے پہل حالی نے ہی متعارف کرایا تھا اس لئے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تخیل کے علاوہ حالی نے تفحص الفاظ اور کائنات کے مطالعہ کو بھی شاعری کے لئے ضروری خیال کیا ہے۔ جہاں تک شعر کا تعلق ہے تو اس کے لئے حالی نے سادگی، اصلیت اور جوش کی شرطیں رکھی ہیں حالانکہ ان کا یہ نظریہ ملٹن کے نظریے سے ماخوذ ہے۔ ملٹن نے اپنے دوست کو ایک خط میں لکھا تھا کہ شاعری میں تین چیزوں کا ہونا بے حد ضروری ہے یعنی "Poetry should be simple, sensuous and passionate". حالی نے انہیں تین الفاظ simple,sensuous,passionate کا ترجمہ سادگی، اصلیت اور جوش کیا ہے۔ ملٹن کے اس خیال تک حالی کی رسائی کرنل ہالرائیڈ کے

ذریعے ہوئی تھی۔ملٹن نے جس سیاق میں ان الفاظ کا استعمال کیا تھا وہ کچھ اور تھا مگر حالی نے اسے سب کچھ سمجھا اور اسے نقل کر دیا۔حالی کے اس لفظی ترجمے پر اعتراض بھی کئے گئے بالخصوص sensuous کے ترجمے ’اصلیت‘ پر۔ناقدین کا خیال ہے کہ اس کا ترجمہ ’احتساسی یا حسیاتی‘ ہونا چاہئے تھا۔اس طرح حالی نے مغربی نظریوں کو اردو تنقید میں متعارف کرایا۔

حالی کے مقدمہ میں شعر و شاعری کے تعلق سے مزید بحثیں ملتی ہیں مثلاً حالی شعر کے لئے وزن اور قافیہ کو ضروری خیال نہیں کرتے مگر یہ اعتراف ضرور کرتے ہیں کہ ان کے استعمال سے شعر کا حسن بڑھتا ہے۔اس مقدمہ کے دوسرے حصے میں شعری اصناف کے حوالے سے بھی بحثیں ملتی ہیں جس میں مثنوی کو سب سے کارآمد صنف قرار دیا گیا ہے اور مرثیے کو اخلاقی تعلیم کے لئے مفید بتایا گیا ہے۔مقدمہ میں صنفِ غزل پر اعتراض کیا گیا ہے اور قصیدے کے تعلق سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ان تمام بحثوں کے پیچھے انہوں نے دلیلیں بھی دی ہیں اور وجہ بھی بتائی ہے۔

غرض ’مقدمہ شعر و شاعری‘ میں حالی نے جن مغربی نظریات کی بحثیں اٹھائی ہیں ان کا ہو بہو چربہ نہیں اتارا ہے بلکہ اس کی افہام و تفہیم کی پوری کوشش کی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انہیں عملی جامہ بھی پہنانے کی سعی کی ہے۔یہ سچ ہے کہ مقدمہ کی بحثیں بعض وقت تشنہ معلوم ہوتی ہیں مگر مقدمہ کے اصل مقصد کے پیشِ نظر حالی نے جس وضاحت، ذہانت اور بلاغت کا ثبوت دیا ہے وہ قابلِ احترام ہے۔

انیسویں صدی نصف آخر کے سیاسی، سماجی اور ادبی منظرنامے نے بیسویں صدی کے سیاسی، سماجی اور ادبی منظرنامے کے لئے نئی راہیں ہموار کیں۔اگر ادبی صورتِ حال پر نظر ڈالیں تو بیسویں صدی کے آغاز میں جہاں روایتی غزلیہ شعری جہت پر قدغن لگا وہیں وہیں نظمیہ شاعری کو ایک نئی جست ملی۔جدید غزل گو شعراء مثلاً: حسرت، اصغر، جگر، فانی، فراق، یگانہ وغیرہ نے غزل گوئی میں نئے طرزِ اسلوب کو فروغ دیا۔اسی طرح نظم گو شعراء مثلاً: محمد اقبال، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، مخدوم محی الدین، ن۔م۔راشد، فیض، میراجی، مجاز، علی سردار جعفری، اختر الایمان وغیرہ نے نئی کیفیات کو شعری لباس عطا کیا۔سرسید نے جو اندازِ اسلوب نثر میں اختیار کیا تھا اس کی پیروی ہمارے فکشن لکھنے والوں نے کیا۔مغربی اساسِ نقد پر ادبی تخلیقات کا جائزہ شروع ہوا۔تحقیق کی طرف بھی خصوصی توجہ دی گئی۔گو کہ نئے زمانے نے پرانے زمانے سے روشنی

حاصل کی اور ادب کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔

مصادر:

۱۔ اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر: ابوالخیر کشفی

۲۔ دلّی کا دبستانِ شاعری: نور الحسن ہاشمی

۳۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری: ابواللیث صدیقی

۴۔ تاریخِ نثرِ اردو: احسن مارہروی

۵۔ تاریخِ ادبِ اردو: جمیل جالبی

۶۔ مختصر تاریخِ ادبِ اردو: انور سدید

۷۔ اردو ادب کی تحریکیں: انور سدید

۸۔ قومی یکجہتی اور اور سیکولرازم: تاراچند

۹۔ تنقیدی دبستان: سلیم اختر

۱۰۔ مرحوم دلّی کالج: مولوی عبد الحق

۱۱۔ انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدّن کی تاریخ: عبداللہ یوسف علی

۱۲۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں: عبدالمجید سالک

☆☆☆